صریرخامہ
SAREER A KHAMA
TAFHEEM RESEARCH CENTRE
Category Y
ISSN Online: 3005-947X
ISSN Print: 3005-9461
Vol: 05, Issue 01 (Jan-March 2026)

قرآنی تصورِ حیات: مقاصد، انفرادی و اجتماعی اثرات اور عصری معنویت کا تجزیاتی مطالعہ

The Qur'anic Concept of Life: An Analytical Study of Its Objectives, Individual and Collective Effects, and Contemporary Relevance

Tooba Khalid
PhD Scholar, Department of Islamic Studies, Division of Islamic and Oriental Learning, University of Education, Lahore, **(Corresponding Author)**
Toobakhalid2024@gmail.com , https://orcid.org/0009-0003-2759-5745

Dr. Imran Hayat
Lecturer, Department of Islamic Studies, Division of Islamic and Oriental Learning, University of Education, Lahore, Pakistan
imran.hayat@ue.edu.pk , https://orcid.org/0000-0003-0647-0989

Dr. Hafiz Muhammad Abrar Awan
Assistant Professor, Department of Urdu Encyclopedia of Islam, University of the Punjab, Lahore
abrara.uei@pu.edu.pk , https://orcid.org/0000-0002-5345-8424

Abstract:
The study seeks to investigate the Qur'anic concept of life, with particular attention to its objectives, individual and collective implications, and contemporary relevance. Using a qualitative, thematic, and analytical approach, it examines selected Qur'anic passages concerning worldly life, spiritual awakening, ḥayāt ṭayyibah (the good life), death and resurrection, and the signs of life in the created world. The study also draws upon representative classical exegetical works and selected modern scholarship to examine the meanings and broader implications of these Qur'anic concepts. The analysis shows that the Qur'an does not reduce life to biological existence or material achievement; rather, it relates human existence to faith, righteous action, self-purification, moral responsibility, and accountability before God. Worldly life is neither presented as something to be rejected nor as an end in itself, but as a temporary and morally significant sphere of trial, action, and responsibility, whose consequences extend into the Hereafter. At the individual level, this understanding of life provides a sense of purpose and encourages spiritual awareness, patience, gratitude, ethical self-discipline, and inner balance. At the collective level, it connects individual moral development with justice, mutual responsibility, human dignity, and social reform. The study further highlights the contemporary relevance of this Qur'anic understanding in addressing materialism, moral uncertainty, social fragmentation, and the growing crisis of meaning. It concludes that the Qur'anic concept of life offers a balanced understanding of human existence in which worldly action, spiritual development, moral responsibility, and ultimate accountability remain closely connected.

Keywords: *Qur'anic concept of life; ḥayāt; ḥayāt ṭayyibah; moral agency; self-purification; social responsibility; Hereafter; contemporary relevance*

تعارف

انسانی زندگی کے بارے میں قرآن مجید کا تصور محض وجود، بقا یا مادی کامیابی کے سوال تک محدود نہیں؛ یہ مقصدِ حیات، اخلاقی اختیار، روحانی ارتقا، اجتماعی ذمہ داری اور آخرت کی جواب دہی کو ایک مربوط نظام میں جمع کرتا ہے۔ قرآن میں حیات کا لفظ دنیاوی زندگی، قلبی و روحانی بیداری، حیاتِ طیبہ، حیاتِ اخروی اور کائنات میں زندگی کے مظاہر کے لیے استعمال ہوا ہے۔ سابقہ مباحث میں عموماً ان جہات کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے، لیکن ان کے باہمی ربط، انسانی کردار پر اثرات اور موجودہ فکری و اخلاقی بحرانوں میں ان کی معنویت کو یکجا کر کے دیکھنے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ زیرِ نظر مطالعہ اسی علمی خلا کو سامنے رکھتے ہوئے یہ سوال اٹھاتا ہے کہ قرآن حیات کی حقیقت اور غایت کو کس طرح متعین کرتا ہے، اس تصور کے انفرادی و اجتماعی نتائج کیا ہیں، اور عصرِ حاضر میں یہ تصور ایک متوازن اخلاقی زاویۂ نظر کیسے فراہم کر سکتا ہے۔ یہ تحقیق نوعیتی (qualitative)، موضوعاتی اور تجزیاتی منہج پر مبنی ہے۔ پہلے قرآنِ مجید کی ان آیات کو منتخب کیا گیا ہے جن میں حیات، موت، احیا، حیاتِ دنیا، حیاتِ طیبہ اور آخرت کے تصورات براہِ راست یا معنوی طور پر زیرِ بحث آتے ہیں۔ پھر لغوی مصادر، کلاسیکی تفاسیر اور منتخب جدید علمی مباحث کی روشنی میں ان آیات کا سیاقی مطالعہ کیا گیا ہے جدید اور برصغیری قرآنی مطالعات میں انسانی زندگی، اخلاقی ذمہ داری اور قرآنی ہدایت کے باہمی تعلق پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے تدبرِ قرآن میں انسان کی دنیاوی زندگی کو امتحان، اخلاقی ذمہ داری اور آخرت کی جواب دہی کے ساتھ مربوط کر کے واضح کیا ہے، جبکہ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے تفہیم القرآن میں قرآن کو محض نظری عقائد کا مجموعہ نہیں بلکہ انسانی انفرادی و اجتماعی زندگی کی عملی رہنمائی فراہم کرنے والی کتاب کے طور پر پیش کیا ہے۔ فضل الرحمن نے قرآن کے مرکزی موضوعات کو خدا، انسان، معاشرہ اور اخلاقی ذمہ داری کے باہمی تعلق میں سمجھایا، جبکہ توشی ہیکو ایزوتسو نے قرآنی اخلاقی اصطلاحات کے باہمی معنوی نظام کا تجزیہ کیا ہے۔ اسی طرح عبداللہ سعید نے معاصر حالات میں قرآنی ہدایات کی تفہیم کے لیے سیاقی مطالعے کی اہمیت واضح کی ہے۔ تحقیق کا مقصد تمام متعلقہ آیات کا استقصا یا سائنسی اعجاز کا دعویٰ نہیں، بلکہ قرآنی تصورِ حیات کی بنیادی جہات، ان کے باہمی ربط اور اخلاقی نتائج کی توضیح ہے۔ مطالعے کے بنیادی سوالات یہ ہیں: (1) قرآنِ مجید زندگی کی حقیقت اور غایت کو کن اصولوں سے واضح کرتا ہے؟ (2) دنیاوی، روحانی اور اخروی حیات کا باہمی تعلق کیا ہے؟ (3) حیاتِ طیبہ فرد اور معاشرے کی تشکیل میں کیا کردار ادا کرتی ہے؟ اور (4) یہ تصور عصرِ حاضر کے فکری، اخلاقی، سماجی اور ماحولیاتی مسائل کے لیے کیا رہنمائی فراہم کرتا ہے؟

حیات کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

اہلِ لغت کے نزدیک یہ لفظ ایسی حالت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں شعور اور حرکت کا ظہور ہو۔

چنانچہ لسان العرب میں ابن منظورؒ نے لکھا ہے:

"الحَيَاةُ نَقِيضُ المَوْتِ، وَهِيَ مَا يَكُونُ بِهِ الإِحْسَاسُ وَالحَرَكَةُ"(i)

"حیات موت کی ضد ہے اور وہ کیفیت ہے جس کے ذریعے احساس اور حرکت پیدا ہوتی ہے۔"

اس لغوی تعبیر کے مطابق حیات کا بنیادی مفہوم ادراک، حرکت اور بقا سے وابستہ ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ انسان، حیوانات اور نباتات کی زندگی کے لیے استعمال ہوتا ہے، تاہم قرآنی اور ادبی اسلوب میں اس کا اطلاق روحانی بیداری، ایمانی شعور اور نشاطِ حیات پر بھی ہوتا ہے۔ اس تنوع سے واضح ہوتا ہے کہ عربی لغت میں حیات کا مفہوم محض جسمانی زندگی تک محدود نہیں بلکہ مختلف مادی، معنوی اور روحانی جہات کا احاطہ کرتا ہے۔ اصطلاحی اعتبار سے اسلامی فکر میں حیات کو ایسی صفت قرار دیا گیا ہے جس کے نتیجے میں شعور اور قدرت کا اظہار ہوتا ہے۔ متکلمین نے اس صفت کو وجود کی فعّالیت اور ادراک کے ساتھ جوڑا ہے۔

علامہ الجرجانیؒ فرماتے ہیں:

"الحياة صفةٌ يترتب عليها الإدراك والقدرة"[ii]

"حیات ایک ایسی صفت ہے جس کے نتیجے میں ادراک اور قدرت ظاہر ہوتے ہیں۔"

یہ تعریف علمِ کلام کے تناظر میں حیات کی حقیقت کو واضح کرتی ہے۔ انسانی وجود میں شعور اور ارادہ کی جو کیفیت پائی جاتی ہے وہ اسی صفت سے وابستہ ہے۔ اس تصور میں زندگی کا تعلق جسمانی فعالیت کے ساتھ ساتھ روحانی شعور سے بھی ہے۔ اسی مفہوم کو راغب اصفہانی کی مفردات اَلفاظ القرآن میں بھی دیکھا جاسکتا ہے، جہاں حیات کے مادے کو زندگی اور اس کی مختلف معنوی جہات کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ عربی میں حیات کا مفہوم صرف جسمانی بقا تک محدود نہیں بلکہ اس کے سیاق کے مطابق اس میں زندگی، نشوونما اور معنوی فعالیت کے پہلو بھی شامل ہو سکتے ہیں۔[iii] ابن عاشور کے نزدیک بھی "حیاتِ طیبہ" کا تعلق محض مادی آسائش سے نہیں بلکہ اس طرزِ زندگی سے ہے جو ایمان اور عملِ صالح کے نتیجے میں انسان کو دنیا میں پاکیزہ اور بامعنی زندگی عطا کرتی ہے۔ اس اعتبار سے حیاتِ طیبہ قرآنی اخلاقی تصور میں ایمان اور عمل کے عملی ثمر کے طور پر سامنے آتی ہے۔[iv]

قرآنِ کریم میں حیات کے استعمالات اور معنوی جہات

قرآنِ مجید میں حیات ایک جامع اور کثیر المعنی اصطلاح ہے جو محض جسمانی زندگی تک محدود نہیں بلکہ مادی، نباتاتی، انسانی، روحانی اور اخروی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بھی محیط ہے۔ مختلف قرآنی سیاقات میں اس لفظ کا استعمال کائنات کے نظام، انسانی وجود، اللہ تعالیٰ کی قدرت اور ہدایت کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کیا گیا ہے، جس سے اس کے معنوی تنوع اور فکری گہرائی کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی بنا پر مفسرین نے لفظِ حیات کے استعمالات کا سیاقی اور معنوی تجزیہ کرتے ہوئے اس کے مختلف مفاہیم اور دلالات کو نمایاں کیا ہے۔ قرآن کریم میں لفظ حیات

مختلف معانی اور سیاق و سباق کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ بعض مقامات پر اس سے دنیاوی زندگی مراد ہے اور بعض مقامات پر آخرت کی ابدی زندگی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا هَٰذِهِ ٱلْحَيَوٰةُ ٱلدُّنْيَآ إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ وَإِنَّ ٱلدَّارَ ٱلْءَاخِرَةَ لَهِىَ ٱلْحَيَوَانُ﴾ (v)

"اور یہ دنیا کی زندگی کھیل اور تماشے کے سوا کچھ نہیں اور بے شک آخرت کا گھر ہی اصل زندگی ہے۔"

اس آیت میں دنیاوی زندگی کی عارضی اور محدود حیثیت کے مقابلے میں آخرت کی زندگی کو حقیقی اور دائمی قرار دیا گیا ہے، جس سے حیات کے مادی اور ابدی دو الگ مگر باہم مربوط درجات واضح ہوتے ہیں۔ اس تقابل کے ذریعے قرآنِ کریم انسان کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ دنیا کی زندگی امتحان اور عمل کا مرحلہ ہے، جبکہ اس کے نتائج کا ظہور آخرت کی دائمی زندگی میں ہو گا، لہٰذا انسان کی اخلاقی اور روحانی ذمہ داری اسی تناظر میں متعین ہوتی ہے۔ مفسرین نے لفظِ حیات کے مفہوم کی توضیح کرتے ہوئے اس کے روحانی پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ انسانی دل جب ایمان اور اطاعت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے تو اس میں ایک ایسی زندگی پیدا ہوتی ہے جو اخلاقی اور روحانی بیداری کا سرچشمہ بنتی ہے۔ امام فخر الدین رازی نے بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انسانی زندگی کی اصل قدر کو معرفت اور شعور کے ساتھ جوڑا ہے۔ ایزوتسو کے تجزیے کے مطابق قرآنی اخلاقیات کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ اخلاقی خیر و شر کو آخرت کی جواب دہی سے الگ نہیں کیا گیا؛ انسان کا موجودہ طرزِ عمل اس کے آخری انجام سے مربوط رہتا ہے۔ vi

قرآنی تصورِ حیات کی چند بنیادی خصوصیات سامنے آتی ہیں۔

- پہلی خصوصیت اس کی جامعیت ہے جس میں جسمانی، روحانی اور اخلاقی پہلو یکجا ہو جاتے ہیں۔
- دوسری خصوصیت مقصدیت ہے جس کے تحت انسانی زندگی کو ایک ذمہ دارانہ سفر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔
- تیسری خصوصیت توازن ہے جس میں دنیا اور آخرت کے درمیان اعتدال کی راہ دکھائی جاتی ہے۔

قرآنی تصورِ حیات محض حیاتیاتی وجود تک محدود نہیں بلکہ انسان کی روحانی، اخلاقی اور ایمانی زندگی کو بھی اپنے دائرۂ مفہوم میں شامل کرتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿أَوَمَن كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ﴾ (vii)

"کیا وہ شخص جو مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کے لیے ایک نور بنایا جس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے؟"

یعنی حیات کا مفہوم محض جسمانی بقا تک محدود نہیں بلکہ روحانی بیداری، ایمان اور ہدایت سے وابستہ ہے۔ قرآنِ کریم کے مطابق حقیقی زندگی وہ ہے جو انسان کے قلب و شعور کو ایمان کی روشنی سے منور کرے اور اس کے فکری، اخلاقی اور عملی رویوں میں مثبت تبدیلی پیدا کرے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآنی تصورِ حیات مادی وجود کے ساتھ ساتھ روحانی ارتقا کو بھی بنیادی اہمیت دیتا ہے۔

امام فخر الدین رازی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

"المراد بالحياة هنا حياة القلب بنور الإيمان والهداية "[viii]

"یہاں زندگی سے مراد ایمان اور ہدایت کے نور کے ذریعے دل کی زندگی ہے۔"

قرآنِ کریم میں حیات اور موت کا تقابل نہایت بلیغ اور معنویت سے بھرپور اسلوب میں پیش کیا گیا ہے، جس کے ذریعے زندگی کی حقیقت، اس کے مقصد اور انسان کی ذمہ داری کو واضح کیا جاتا ہے۔ یہ تقابل اس امر کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ حیات محض ایک حیاتیاتی عمل نہیں بلکہ آزمائش، ہدایت اور آخرت کی تیاری کا مرحلہ ہے، جبکہ موت ایک مرحلۂ انتقال ہے جو ابدی زندگی کی طرف پیش رفت کی علامت ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ﴾[ix]

"تم اللہ کے ساتھ کس طرح کفر کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے پھر اس نے تمہیں زندگی عطا کی۔"

اس اسلوب میں قرآنِ کریم انسان کے آغاز اور انجام دونوں کو ایک ہی تناظر میں بیان کرتا ہے۔ انسان بے جان حالت سے زندگی پاتا ہے اور بالآخر موت سے گزر کر دوبارہ اپنے رب کی طرف لوٹایا جاتا ہے، جس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور انسان کی کامل وابستگی نمایاں ہوتی ہے۔

محمد بن جریر طبری اس آیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

" ذكر الله الموت والحياة ليبين قدرته على الخلق والإعادة "[x]

"اللہ نے موت اور زندگی کا ذکر اپنی قدرتِ تخلیق اور دوبارہ پیدا کرنے کی قدرت کو واضح کرنے کے لیے کیا ہے۔"

قرآنِ کریم میں حیات کا تصور صرف انسان تک محدود نہیں بلکہ نباتات، حیوانات اور دیگر جاندار مخلوقات کو بھی شامل ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن زندگی کو ایک ہمہ گیر نظام کے طور پر پیش کرتا ہے، جس کے تمام مظاہر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کی نشانیاں ہیں۔

ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾[xi]

"اور ہم نے پانی سے ہر جاندار چیز کو پیدا کیا۔"

یہ آیت اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ پانی زندگی کے ظہور اور بقا کا بنیادی ذریعہ ہے۔ یہ قرآنی بیان نہ صرف کائنات میں پانی کی بنیادی اہمیت کو واضح کرتا ہے بلکہ جدید سائنسی تحقیقات بھی زندگی کے لیے پانی کے ناگزیر کردار کی تائید کرتی ہیں۔ قرآنِ مجید مردہ زمین کے بارش سے سرسبز ہونے کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نمایاں نشانی قرار دیتا ہے۔ یہ مثال نہ صرف حیات کے ظہور کے فطری نظام کو نمایاں کرتی ہے بلکہ انسان کو تخلیق، احیائے زمین اور بعث بعد الموت کے باہمی تعلق پر بھی غور کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ﴾ (xii)

"اور تم زمین کو خشک دیکھتے ہو، پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ لہلہانے لگتی ہے اور ابھر آتی ہے۔"

یہ منظر انسانی فکر کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ حیات کا ظہور خالق کی قدرت اور اس کے نظامِ تدبیر کا مظہر ہے۔

امام قرطبی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

" إحياء الأرض بعد موتها دليل على قدرة الله على إحياء الخلق بعد موتهم " (xiii)

"زمین کے مردہ ہونے کے بعد اس کا زندہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ مخلوق کو موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے۔"

قرآنِ کریم انسانی زندگی کو محض وجودی حقیقت کے طور پر نہیں بلکہ اخلاقی ذمہ داری کے میدان کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس تناظر میں انسان اپنے اعمال، فیصلوں اور طرزِ عمل کے لیے جواب دہ ہے، اور اسی بنیاد پر اس کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ ہوگا۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (xiv)

"وہی ہے جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے۔"

قرآن میں زندگی کو ایک امتحانی مرحلہ قرار دیا گیا ہے۔ انسانی وجود کے اندر موجود صلاحیتیں اسی امتحان کے ذریعے نمایاں ہوتی ہیں اور اسی کے ذریعے اس کے اخلاقی معیار کا تعین ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں حیات کا تصور محض جسمانی زندگی تک محدود نہیں بلکہ اس میں مادی، روحانی، اخلاقی اور اخروی تمام پہلو شامل ہیں۔ اسی جامع تصور کی روشنی میں انسانی وجود کو ایک بامقصد، ذمہ دار اور شعور رکھنے والی حقیقت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جس کا اپنے خالق سے تعلق اس کی فکر، کردار اور انجام کی بنیاد بنتا ہے۔

حیات کی اقسام اور ان کا باہمی تعلق

قرآنِ حکیم میں حیات کو ایک جامع اور باہم مربوط نظام کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جس میں دنیاوی، روحانی اور اخروی زندگی ایک دوسرے سے جدا نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے مختلف مراحل ہیں۔ دنیا انسان کے لیے عمل، آزمائش اور ذمہ داری کا میدان ہے، جبکہ آخرت اسی زندگی کے نتائج کے ظہور کا مرحلہ ہے۔ اسی تناظر میں مفسرین نے حیات کی مختلف اقسام کو ایک مربوط تصور کے تحت بیان کیا ہے، جہاں انسانی شخصیت کی تکمیل مادی اور روحانی دونوں پہلوؤں کے توازن سے وابستہ ہے۔ بعد ازاں قرآنِ کریم حیاتِ دنیوی کو انسان کے امتحان اور عملی ذمہ داری کے میدان کے طور پر متعارف کراتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ﴾ (xv)

"دنیا کی زندگی دھوکے کا سامان ہے۔"

اس آیت میں دنیاوی زندگی کی عارضی حیثیت کو نمایاں کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نعمتیں دائمی نہیں بلکہ آزمائش کا حصہ ہیں۔ اسی لیے قرآنِ کریم انسان کو دنیا کی ظاہری کشش کے بجائے اس کے مقصد اور ذمہ داری پر توجہ دینے کی تلقین کرتا ہے۔

امام قرطبی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

" أي أن الدنيا متاع قليل يزول ولا بقاء له "(xvi)

"یعنی دنیا ایک کم مدت کا سامان ہے جو زائل ہو جاتا ہے اور اس میں دوام نہیں۔"

اس کے مقابلے میں قرآن کریم حیاتِ اخروی کو حقیقی اور دائمی زندگی کے طور پر پیش کرتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِنَّ الدَّارَالْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْكَانُوايَعْلَمُونَ﴾ (xvii)

"اور یقیناً آخرت کا گھر ہی اصل زندگی ہے اگر وہ جانتے۔"

اس آیت میں آخرت کی زندگی کو "الحیوان" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس میں کامل اور دائمی زندگی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ مفسرین کے نزدیک یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ آخرت کی زندگی فنا اور زوال سے پاک ہے۔

امام فخر الدین رازی اس آیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"الحيوان هو الحياة الكاملة الدائمة التي لا موت فيها"(xviii)

"حیوان سے مراد وہ کامل اور دائمی زندگی ہے جس میں موت کا کوئی وجود نہیں۔"

قرآنِ کریم انسانی وجود کے مادی اور روحانی دونوں پہلوؤں کو اہمیت دیتا ہے۔ جسمانی حیات انسان کی طبعی ضروریات سے وابستہ ہے، جبکہ روحانی حیات ایمان، ہدایت اور اخلاقی شعور سے تشکیل پاتی ہے۔ اسی لیے قرآن انسان کی تخلیق کو جسم اور روح کے امتزاج کے طور پر بیان کرتا ہے، جو اس کے متوازن اور بامقصد وجود کی بنیاد ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ﴾(xix)

"پھر اس نے اسے درست بنایا اور اس میں اپنی روح پھونک دی۔"

اس آیت میں انسانی تخلیق کے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔

- ایک جسمانی تشکیل۔
- دوسرا روحانی عنصر جو انسانی وجود کو شعور اور ادراک عطا کرتا ہے۔ قرآن کریم میں دنیاوی اور اخروی زندگی کے درمیان ایک گہرا ربط بیان کیا گیا ہے۔ دنیا کی زندگی انسان کے اعمال کی بنیاد بنتی ہے اور آخرت میں انہی اعمال کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَن كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ﴾(xx)

"جو شخص آخرت کی کھیتی چاہتا ہے ہم اس کی کھیتی میں اضافہ کر دیتے ہیں۔"

اس آیت میں دنیاوی اعمال کو ایک کھیتی سے تشبیہ دی گئی ہے جس کے نتائج آخرت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس اسلوب کے ذریعے انسانی زندگی کے دونوں مراحل کے درمیان ایک واضح تعلق سامنے آتا ہے۔ انسانی زندگی میں روحانی اور مادی توازن کی اہمیت بھی قرآن کے عمومی پیغام کا حصہ ہے۔ قرآن کریم انسان کو اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ وہ دنیا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی آخرت کو بھی پیشِ نظر رکھے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا﴾(xxi)

"اور جو کچھ اللہ نے تمہیں دیا ہے اس کے ذریعے آخرت کا گھر تلاش کرو اور دنیا میں اپنے حصے کو نہ بھولو"۔

یہ قرآنی تعلیمات انسانی زندگی میں توازن اور اعتدال کے اصول کو نمایاں کرتی ہیں۔ قرآن انسان کو دنیا کی جائز نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ آخرت کی کامیابی کو بھی پیشِ نظر رکھنے کی ہدایت دیتا ہے۔ اسی توازن کو مفسرین انسانی شخصیت کی فکری، اخلاقی اور روحانی تکمیل کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔

حیاتِ طیبہ کا قرآنی تصور

قرآنِ مجید میں حیاتِ طیبہ سے مراد ایسی زندگی ہے جو ایمان، عملِ صالح اور اخلاقِ حسنہ پر استوار ہو۔ یہ تصور انسان کی زندگی کو محض مادی آسائش تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اسے روحانی اطمینان، اخلاقی استقامت اور اجتماعی ذمہ داری سے جوڑتا ہے۔ اسی بنا پر مفسرین نے حیاتِ طیبہ کو ایسی متوازن اور باوقار زندگی قرار دیا ہے جو انسان کی ظاہری اور باطنی اصلاح کا ذریعہ بنتی ہے۔ قرآن کریم میں حیاتِ طیبہ کا تصور ایک جامع اور بامعنی حقیقت کے طور پر بیان ہوا ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً﴾ (xxii)

"جو شخص نیک عمل کرے، خواہ مرد ہو یا عورت، اور وہ مومن ہو تو ہم اسے ضرور پاکیزہ زندگی عطا کریں گے۔"

اس آیت میں حیاتِ طیبہ کو ایمان اور عملِ صالح کا ثمر قرار دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کی حقیقی قدر مادی وسائل سے نہیں بلکہ اس کے اخلاقی کردار، روحانی بالیدگی اور صالح طرزِ عمل سے متعین ہوتی ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے حیاتِ طیبہ کی توضیح میں واضح کیا ہے کہ اس سے مراد لازماً فقر و مرض سے خالی زندگی نہیں، بلکہ ایسی باطنی کیفیت ہے جس میں انسان اطاعتِ الٰہی کے نتیجے میں صبر، شکر اور رضا و تسلیم کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ [xxiii]

امام ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

" الحياة الطيبة هي السعادة والطمأنينة في الدنيا "(xxiv)

"حیاتِ طیبہ سے مراد دنیا میں سعادت اور قلبی اطمینان ہے۔"

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ حیاتِ طیبہ کا سرچشمہ ایمان اور عملِ صالح ہیں۔ ایمان انسان کی فکر و کردار کو صحیح سمت عطا کرتا ہے، جبکہ نیک اعمال اس ایمان کا عملی اظہار بنتے ہیں، جس کے نتیجے میں انسان کی زندگی میں باطنی اطمینان، اخلاقی استحکام اور فکری توازن پیدا ہوتا ہے۔ مومن کو اگر کبھی معاشی تنگی یا کوئی تکلیف بھی پیش آتی ہے تو دو چیزیں اس کو پریشان نہیں ہونے دیتیں: ایک قناعت اور سادہ زندگی کی عادت، دوسرے اس کا یہ عقیدہ کہ مجھے اس تنگی اور بیماری کے بدلے میں آخرت کی عظیم الشان دائمی نعمتیں ملنے والی ہیں۔ [xxv] اس تفسیر

سے واضح ہوتا ہے کہ حیاتِ طیبہ کا تعلق صرف ظاہری آسائش سے نہیں بلکہ ایمان، قناعت، آخرت کے یقین اور حالات کے مقابل اخلاقی و روحانی استقامت سے ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَىٰ لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ﴾(xxvi)

"جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے ان کے لیے خوش حالی ہے اور بہترین انجام ہے۔"

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ ایمان اور عملِ صالح ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ جب عقیدہ انسان کے کردار اور طرزِ عمل میں نمایاں ہو تو اس کی زندگی حقیقی معنوں میں پاکیزگی اور استقامت سے آراستہ ہوتی ہے، جو قرآنی تصورِ حیاتِ طیبہ کی بنیادی خصوصیت ہے۔ مولانا عبدالرحمن کیلانی بھی حیاتِ طیبہ کو ایمان اور عملِ صالح کے نتیجے میں حاصل ہونے والی پاکیزہ زندگی کے طور پر واضح کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں "اچھی زندگی" کا معیار محض مادی آسائش نہیں۔ xxvii

ارشادِ خداوندی ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾(xxviii)

"بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

اسی طرح شکر کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾(xxix)

"اگر تم شکر کروگے تو میں تمہیں اور زیادہ عطا کروں گا۔"

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ، صبر اور شکر انسانی کردار کی تشکیل میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ تقویٰ انسان کے طرزِ عمل کو منضبط کرتا ہے، صبر آزمائش کے مواقع پر ثابت قدمی پیدا کرتا ہے، جبکہ شکر انسان میں نعمتوں کے درست ادراک اور مثبت رویے کو فروغ دیتا ہے، اور یہی اوصاف حیاتِ طیبہ کے عملی مظاہر بن کر سامنے آتے ہیں۔ امام قرطبی نے ان صفات کو انسانی زندگی کے اخلاقی استحکام کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ قرآنِ کریم کے مطابق حیاتِ طیبہ کے آثار فرد اور معاشرہ دونوں پر مرتب ہوتے ہیں۔ انفرادی سطح پر یہ قلبی اطمینان، اخلاقی پاکیزگی اور کردار کی مضبوطی کا سبب بنتی ہے، جبکہ اجتماعی سطح پر عدل، باہمی اعتماد، اخوت اور احترامِ انسانیت جیسے اوصاف کو فروغ دے کر ایک صالح اور متوازن معاشرے کی تشکیل میں کردار ادا کرتی ہے۔ حیاتِ طیبہ کے ثمرات انسان کی روحانی، اخلاقی اور معاشرتی زندگی میں

نمایاں ہوتے ہیں۔ ایمان، تقویٰ اور عملِ صالح انسان کے باطن کی اصلاح کے ساتھ اس کے کردار کو بھی سنوارتے ہیں، جس کے نتیجے میں اس کی زندگی میں اخلاقی استقامت، روحانی اطمینان اور دوسروں کے ساتھ خیر خواہی کا رویہ فروغ پاتا ہے۔

قرآنی تصورِ حیات کے عملی تقاضے

قرآنِ مجید میں حیات کا تصور محض وجودِ انسانی کی بقا تک محدود نہیں بلکہ اسے ایک ذمہ دار اور بامقصد زندگی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس تناظر میں زندگی ایمان، اخلاق، عمل اور اجتماعی ذمہ داری سے گہرا تعلق رکھتی ہے، جس کے باعث قرآنی تصورِ حیات چند واضح عملی تقاضوں کو جنم دیتا ہے۔ یہی تقاضے فرد کے کردار کی تعمیر اور ایک صالح معاشرے کے قیام کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ مفسرین اور اہلِ علم نے اس پہلو کو نمایاں کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ قرآن میں زندگی کے تصور کا تعلق انسانی کردار کی تشکیل اور اجتماعی فلاح کے ساتھ گہرا ہے۔ قرآن کریم میں انسانی زندگی کے مقصد کو واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (xxx)

”اور میں نے جنات اور انسانوں کو اس کے سوا کسی مقصد کے لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔“

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کی اصل غایت اللہ تعالیٰ کی بندگی ہے۔ یہاں عبادت کا مفہوم محض چند مخصوص عبادات تک محدود نہیں بلکہ ایسا جامع طرزِ زندگی ہے جو انسان کے عقیدے، اعمال اور اخلاقی رویوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے تابع کر دیتا ہے۔ امام طبری اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

” أي ما خلقتهم إلا لآمرهم بعبادتي وأدعوهم إلى توحيدي “(xxxi)

”یعنی میں نے انہیں اس لیے پیدا کیا کہ انہیں اپنی عبادت کا حکم دوں اور انہیں اپنی توحید کی طرف بلاؤں۔“

یہ تعبیر اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ انسانی زندگی کی حقیقی معنویت توحید اور بندگیِ الٰہی سے وابستہ ہے۔ جب انسان کی فکر، کردار اور عملی زندگی اسی بنیاد پر استوار ہو تو اس کے تمام انفرادی اور اجتماعی اعمال ایک واضح مقصد اور اخلاقی سمت اختیار کر لیتے ہیں۔ فضل الرحمن کے مطابق قرآن میں انسانی زندگی کا مقصد اخلاقی ذمہ داری کے احساس کے ساتھ جڑا ہوا ہے جہاں انسان کو اپنے اعمال کے ذریعے اپنی شخصیت کی تکمیل کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ تصور واضح کرتا ہے کہ حیات کا مقصد صرف زندگی گزارنا نہیں بلکہ کردار کی تعمیر بھی ہے۔ اسی لیے قرآن اخلاقی اور روحانی تربیت کو انسانی شخصیت کے استحکام کا بنیادی ذریعہ قرار دیتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا﴾ (xxxii)

"یقیناً وہ کامیاب ہوا جس نے اپنے نفس کو پاک کیا۔"

اس آیت میں انسانی کامیابی کو تزکیۂ نفس سے وابستہ کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی فلاح کا انحصار محض ظاہری اعمال پر نہیں بلکہ باطن کی اصلاح اور اخلاقی ارتقا پر بھی ہے۔

امام فخر الدین رازی اس آیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

" تزكية النفس تكون بتطهيرها من الرذائل وتحليتها بالفضائل "(xxxiii)

"نفس کا تزکیہ اس کو برائیوں سے پاک کرنے اور اچھائیوں سے آراستہ کرنے کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔"

یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اخلاقی اصلاح کا آغاز انسان کے باطن سے ہوتا ہے، اور یہی باطنی تربیت اس کے کردار اور عملی رویوں میں مثبت تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ اسی تناظر میں قرآنِ کریم انسانی زندگی کو ایک اجتماعی ذمہ داری بھی قرار دیتا ہے، جہاں فرد کی اصلاح معاشرے کی اصلاح سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ﴾ (xxxiv)

"تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے ظاہر کی گئی، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔"

اس پیغامِ قرآن میں میں اجتماعی ذمہ داری کا تصور واضح ہوتا ہے۔ معاشرے کی اصلاح اور اخلاقی نظم کی حفاظت انسانوں کی مشترکہ ذمہ داری قرار دی گئی ہے۔ یہ تصور اس بات کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ حیاتِ طیبہ کے اثرات فرد تک محدود نہیں رہتے بلکہ اجتماعی زندگی کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ جب ایمان، عملِ صالح اور اخلاقی پاکیزگی فرد کے کردار کا حصہ بن جائیں تو معاشرے میں عدل، خیر خواہی اور باہمی ذمہ داری جیسے اوصاف فروغ پاتے ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتُ النَّعِيمِ﴾ (xxxv)

"جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے ان کے لیے نعمتوں والی جنتیں ہیں۔"

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور عملِ صالح انسانی فلاح کی بنیادی شرائط ہیں۔ یہی اوصاف فرد کے کردار میں اخلاقی استقامت پیدا کرتے ہیں اور اس کے معاشرتی رویوں کو خیر خواہی، انصاف اور ذمہ داری کے احساس سے آراستہ کرتے ہیں۔

قرآن کے تصورِ انسان میں فرد کو محض اپنی ذاتی ضروریات اور خواہشات کا حامل وجود نہیں سمجھا جاتا بلکہ اسے اخلاقی اختیار اور ذمہ داری رکھنے والی ہستی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد اس کے انفرادی کردار اور معاشرتی ذمہ داری دونوں سے وابستہ ہے۔ اس زاویے سے ایمان، تزکیہ اور اخلاقی عمل فرد کی داخلی اصلاح تک محدود نہیں رہتے بلکہ ایک ذمہ دار معاشرتی کردار کی بنیاد بھی بنتے ہیں۔[xxxvi]

انفرادی اور اجتماعی اثرات

انفرادی سطح پر قرآنی تصورِ حیات انسان کو اپنی زندگی کو اتفاقی یا بے مقصد واقعہ سمجھنے کے بجائے ایک امانت اور ذمہ داری کے طور پر دیکھنے کی تربیت دیتا ہے۔ ایمان مقصد اور سمت فراہم کرتا ہے؛ عبادت تعلق باللہ کو مستحکم کرتی ہے؛ تزکیۂ نفس خواہشات کو اخلاقی نظم میں لاتا ہے؛ اور صبر و شکر انسان کو کامیابی اور آزمائش دونوں میں متوازن رکھتے ہیں۔ اس طرح خوف، محرومی اور کامیابی کے تجربات محض نفسیاتی واقعات نہیں رہتے بلکہ اخلاقی نشوونما کے مواقع بن جاتے ہیں۔ یہ زاویہ اختیار، کوشش اور توکل کے درمیان توازن قائم کرتا ہے اور فرد میں وقار، امید، خود احتسابی اور ذمہ دارانہ عمل کو فروغ دیتا ہے۔ اجتماعی سطح پر یہی تصور انسانی کرامت، عدل، خیر خواہی، امانت اور جواب دہی کو معاشرتی اصول بناتا ہے۔ جب زندگی اللہ کی عطا اور انسان اخلاقی فاعل قرار پاتا ہے تو دوسرے انسان کی جان، عزت، مال اور بنیادی حقوق کا احترام مذہبی و اخلاقی ذمہ داری بن جاتا ہے۔ امر بالمعروف کا مفہوم محض انفرادی نصیحت نہیں، بلکہ ایسا اجتماعی شعور ہے جو ظلم، استحصال، بدعنوانی اور بے حسی کے مقابل اصلاحی کردار ادا کرتا ہے۔ یوں فرد کی باطنی اصلاح اور اداروں کی اخلاقی تشکیل ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں؛ صالح معاشرہ صرف قوانین سے نہیں بلکہ قانون، کردار اور جواب دہی کے امتزاج سے وجود میں آتا ہے۔

اس تناظر میں قرآنی اخلاق فرد اور معاشرے کو دو الگ دائروں کے طور پر نہیں دیکھتا، بلکہ شخصی تزکیہ، اخلاقی اختیار اور اجتماعی ذمہ داری کو ایک مربوط اخلاقی نظام کا حصہ قرار دیتا ہے؛ یہی باہمی ربط جدید قرآنی اخلاقیات کے مطالعات میں بھی نمایاں کیا گیا ہے۔[xxxvii] قرآنی تصور میں انسانی فرد کی اخلاقی ذمہ داری اجتماعی زندگی سے الگ نہیں ہے۔ انسان کی کرامت، مساوات، تقویٰ اور عدل جیسے اصول اس کے دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلقات کو بھی منظم کرتے ہیں۔ اس طرح قرآن فرد کی اصلاح کو معاشرتی اصلاح سے جوڑتا ہے اور اخلاقی زندگی کو صرف نجی کردار نہیں بلکہ اجتماعی ذمہ داری کا مسئلہ بھی قرار دیتا ہے۔[xxxviii] محمد عبداللہ دراز کے مطابق انسانی اخلاقی ذمہ داری انسان کی عقلی و اختیاری حیثیت سے وابستہ ہے؛ انسان متعدد ممکنہ افعال میں سے انتخاب کی صلاحیت رکھتا ہے، اسی لیے اس کے اعمال اخلاقی محاسبے اور جواب دہی کا موضوع بنتے ہیں۔[xxxix] فضل الرحمن کی موضوعاتی قرأت بھی انسان کو محض انفرادی وجود کے طور پر نہیں دیکھتی،

بلکہ اس کی شخصیت اور اخلاقی ذمہ داری کو اجتماعی زندگی سے مربوط کرتی ہے؛ اسی لیے انہوں نے Man as Individual اور Man in Society کو قرآنی فکر کے مستقل مگر باہم مربوط موضوعات کے طور پر پیش کیا ہے۔[xl]

عصری معنویت

عصرِ حاضر میں مادی ترقی کے باوجود معنویت کے بحران، صارفیت، اخلاقی نسبیت، ذہنی اضطراب، سماجی تنہائی اور ماحولیاتی بے اعتدالی نمایاں مسائل ہیں۔ قرآنی تصورِ حیات ان مسائل کا کوئی سطحی یا یک رخی حل پیش نہیں کرتا، بلکہ ایک اصولی فریم ورک مہیا کرتا ہے۔ یہ مادی وسائل کو فی نفسہٖ مذموم نہیں ٹھہراتا، مگر انہیں غایتِ زندگی بنانے سے روکتا ہے؛ انسانی آزادی کو تسلیم کرتا ہے، مگر اسے جواب دہی سے جدا نہیں کرتا؛ اور انفرادی فلاح کو اجتماعی عدل اور خیرِ عامہ کے ساتھ وابستہ کرتا ہے۔ صارفیت کے مقابل حیاتِ طیبہ یہ واضح کرتی ہے کہ معیارِ زندگی صرف ملکیت اور آسائش سے متعین نہیں ہوتا بلکہ ایمان، پاکیزہ کمائی، صالح عمل، تعلقات کی صحت اور قلبی اطمینان بھی اس کے بنیادی اجزا ہیں۔ اخلاقی نسبیت کے مقابل وحی ایک مستقل اخلاقی مرجع فراہم کرتی ہے، جبکہ اختلافی حالات میں عدل، رحمت، امانت اور انسانی کرامت جیسے اصول عملی رہنمائی دیتے ہیں۔ اسی طرح پانی، زمین اور دیگر مظاہرِ حیات کو آیاتِ الٰہی سمجھنے سے فطرت کے ساتھ استحصالی تعلق کے بجائے امانت، اعتدال اور حفاظت کا رویہ پیدا ہوتا ہے۔ جدید اسلامی ماحولیاتی فکر میں بھی فطرت کو محض انسانی استعمال کی شے کے بجائے ایک اخلاقی امانت کے طور پر سمجھا گیا ہے۔ ماویل عزی الدین نے اسلامی ماحولیاتی فکر کی وضاحت کرتے ہوئے پانی، زمین، جاندار مخلوقات، توازن اور قدرتی وسائل کے تحفظ کو قرآنی و اسلامی اخلاقی تصور کے اہم اجزا قرار دیا ہے۔ اس بنا پر تصورِ حیات کی ماحولیاتی جہت انسانی ذمہ داری کو صرف دوسرے انسانوں تک محدود نہیں رکھتی بلکہ تخلیقی نظام اور قدرتی ماحول کے ساتھ بھی اخلاقی تعلق قائم کرتی ہے۔[xli]

محمد عبد الحلیم نے قرآن میں پانی کے موضوع کا تجزیہ کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ پانی صرف حیاتیاتی بقا کا ذریعہ نہیں بلکہ قدرتِ الٰہی، تخلیق، احیائے زمین اور بعث بعد الموت کی دلیل بھی بنتا ہے؛ ساتھ ہی اس کا استعمال انسانی اور اجتماعی ذمہ داری کے عملی پہلوؤں سے مربوط ہوتا ہے۔[xlii] اس تصور کی عصری تطبیق کے لیے محض خطیبانہ بیان کافی نہیں۔ تعلیم میں مقصد، اخلاقی استدلال اور خدمتِ خلق کو جگہ دینا؛ خاندان میں باہمی حقوق اور ذمہ داری کو مضبوط کرنا؛ معیشت میں دیانت اور عدمِ استحصال کو یقینی بنانا؛ اور ریاستی و سماجی اداروں میں شفاف جواب دہی پیدا کرنا ضروری ہے۔ اس طرح قرآنی تصورِ حیات ایک مجرد مابعد الطبیعی تصور کے بجائے فرد، معاشرہ اور اداروں کی اصلاح کے لیے قابلِ عمل اخلاقی بنیاد بن سکتا ہے۔

معاصر حالات میں قرآنی ہدایات کی تطبیق کے لیے ضروری ہے کہ نص کے بنیادی اخلاقی مقاصد کو برقرار رکھتے ہوئے بدلتے ہوئے سماجی، معاشی اور فکری حالات کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے۔ عبد اللہ سعید کے contextualist نقطۂ نظر کے مطابق قرآنی پیغام کی معاصر معنویت اسی

وقت زیادہ واضح ہوتی ہے جب تاریخی سیاق اور موجودہ انسانی حالات دونوں کو تفہیم میں جگہ دی جائے۔ اس زاویے سے تصورِ حیات محض نظری یا مابعد الطبیعی بحث نہیں رہتا بلکہ جدید فرد اور معاشرے کی عملی اخلاقی تشکیل سے مربوط ہو جاتا ہے۔[xliii]

نتائج و خلاصۂ بحث

مطالعے سے واضح ہوا کہ قرآنِ کریم میں حیات ایک جامع، مربوط اور غایت آشنا تصور ہے۔ اس میں جسمانی وجود، قلبی بیداری، اخلاقی اختیار، حیاتِ طیبہ، اجتماعی ذمہ داری اور آخرت کی جواب دہی الگ الگ حقیقتیں نہیں بلکہ ایک ہی اخلاقی نظام کے باہم مربوط اجزا ہیں۔ دنیا عمل اور آزمائش کا میدان ہے، آخرت ان اعمال کے کامل نتائج کا مرحلہ، اور حیاتِ طیبہ ایمان و عملِ صالح کے ذریعے دنیا میں باوقار، متوازن اور بامعنی زندگی کی صورت ہے۔ اس تصور کے انفرادی ثمرات میں مقصدیت، خود احتسابی، صبر، شکر، اخلاقی استقامت اور روحانی اطمینان شامل ہیں؛ جبکہ اجتماعی سطح پر یہ عدل، انسانی کرامت، خیر خواہی، امانت، باہمی ذمہ داری اور اصلاحِ معاشرہ کو تقویت دیتا ہے۔ عصرِ حاضر میں اس کی معنویت اس امر میں ہے کہ یہ مادیت، صارفیت، اخلاقی نسبیت، سماجی بے تعلقی اور ماحولیاتی بے احتیاطی کے مقابل ایک متوازن اخلاقی فریم ورک فراہم کرتا ہے۔ تاہم اس تصور کی حقیقی تاثیر اسی وقت ظاہر ہوگی جب اسے فرد کی تربیت، تعلیمی ترجیحات، معاشی معاملات اور اجتماعی اداروں کی عملی ساخت میں منتقل کیا جائے۔

حوالہ جات

[i] محمد بن مکرم ابن منظور، لسان العرب (بیروت: دار صادر، 1414ھ)، 212۔

[ii] على بن محمد الجرجانی، کتاب التعریفات (بیروت: دار الکتب العلمیة، 1405ھ)، 96۔

[iii] الراغب الأصفهاني، أبو القاسم الحسين بن محمد. مفردات ألفاظ القرآن. دمشق: دار القلم، 2009، مادة: حَيِيَ.

[iv] محمد الطاهر ابن عاشور، التحرير والتنوير، تونس: الدار التونسية للنشر، 1984، ج 14، ص 273، تفسیر سورة النحل، آیت 97۔

[v] القرآن الکریم، سورة العنکبوت، الآیة: 64

[vi] Toshihiko Izutsu, Ethico-Religious Concepts in the Qur'an (Montreal & Kingston: McGill-Queen's University Press, 2002), pp. 203–204.

[vii] القرآن الکریم، سورة الأنعام، الآیة: 122

[viii] فخر الدین الرازی، مفاتیح الغیب، 164۔

[ix] القرآن الکریم، سورة البقرة، الآیة: 28

[x] محمد بن جریر الطبری، جامع البیان عن تأویل آی القرآن، 74۔

[xi] القرآن الکریم، سورة الأنبیاء، الآیة: 30

[xii] القرآن الکریم، سورة الحج، الآیة: 5

[xiii] محمد بن أحمد القرطبي، الجامع لأحكام القرآن (قاہرہ: دار الکتب المصریة، 1964ء)، 18۔

[xiv] القرآن الکریم، سورة الملك، الآیة: 2

[xv] القرآن الکریم، سورة آل عمران، الآیة: 185

[xvi] محمد بن أحمد القرطبي، الجامع لأحكام القرآن، 289۔

[xvii] القرآن الکریم، سورة العنکبوت، الآیة: 64

[xviii] فخر الدین الرازی، مفاتیح الغیب، 97۔

[xix] القرآن الکریم، سورة السجدة، الآیة: 9

[xx] القرآن الکریم، سورة الشوری، الآیة: 20

[xxi] القرآن الکریم، سورة القصص، الآیة: 77

[xxii] القرآن الکریم، سورة النحل، الآیة: 97

[xxiii] اشرف علی تھانوی، مکمل بیان القرآن (کراچی: ایچ۔ ایم۔ سعید کمپنی)، ص 112۔

[xxiv] إسماعیل بن عمر ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم (ریاض: دار طیبة، 1999ء)، 549۔

[xxv] محمد شفیع عثمانی، معارف القرآن، جلد 5، تفسیر سورة النحل، آیت 97۔

[xxvi] القرآن الکریم، سورة الرعد، الآیة: 29

[xxvii] عبدالرحمن کیلانی، تیسیر القرآن، تفسیر سورة النحل، آیت 97۔

[xxviii] القرآن الکریم، سورة البقرة، الآیة: 153

[xxix] القرآن الکریم، سورة إبراهیم، الآیة: 7

[xxx] القرآن الکریم، سورة الذاریات، الآیة: 56

[xxxi] محمد بن جریر الطبری، جامع البیان عن تأویل آی القرآن، 33۔

[xxxii] القرآن الکریم، سورة الشمس، الآیة: 9

[xxxiii] فخر الدین الرازی، مفاتیح الغیب، 114۔

[xxxiv] القرآن الکریم، سورة آل عمران، الآیة: 110

[xxxv] القرآن الکریم، سورة لقمان، الآیة: 8

[xxxvi] Fazlur Rahman, Major Themes of the Qur'an, 2nd ed. (Chicago: University of Chicago Press, 2009), pp. 17–36.

[xxxvii] Toshihiko Izutsu, *Ethico-Religious Concepts in the Qur'an* (Montreal & Kingston: McGill-Queen's University Press, 2002).

[xxxviii] Fazlur Rahman, Major Themes of the Qur'an, 2nd ed. (Chicago: University of Chicago Press, 2009), pp. 37–64.

[xxxix] M. A. Draz, The Moral World of the Qur'an, trans. Danielle Robinson and Rebecca Masterton (London/New York: I.B. Tauris, 2008), pp. 67–69.

[xl] Fazlur Rahman, Major Themes of the Qur'an, 2nd ed. (Chicago: University of Chicago Press, 2009), pp. 17–64.

[xli] Mawil Izzi Dien, The Environmental Dimensions of Islam (Cambridge: The Lutterworth Press, 2000).

[xlii] Muhammad Abdel Haleem, Understanding the Qur'an: Themes and Style (London/New York: I.B. Tauris, 2010), pp. 31–41.

[xliii] Abdullah Saeed, Reading the Qur'an in the Twenty-First Century: A Contextualist Approach (London/New York: Routledge, 2014).